۱۹

اسلامی نظامِ عدل و قضا میں شہادت کا تصوّر

شریعۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (۱۹)

اسلامی نظام عدل و قضاء میں شہادت کا تصور

شہزاد اقبال شام

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ☆ اسلام آباد

اسلامی نظام عدل وقضا میں

شہادت کا تصوّر

تالیف: شہزاد اقبال شام

نظر ثانی وراہ نمائی: ۱۔ جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن

۳۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی

نگران شعبہ مطالعہ اسلامی قانون: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں

نگران منشورات: ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین

ناشر: شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: اظہار پرنٹرز۔۹، ریٹی گن روڈ لاہور

طباعت اوّل: ۱۹۹۳ء ، دوم: ۱۹۹۶ء ، سوم: ۲۰۰۲ء

چہارم: ۲۰۰۳ء ، پنجم: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۰ روپے

فہرست مضامین

۱۔ تمہید ۱

۲۔ وسائل فیصلہ ۱

(۱) اقرار ۲

(۲) قسم ۲

(۳) قرائن ۲

۳۔ شہادت کی تعریف ۳

۴۔ نصاب شہادت ۴

(۱) حد زنا کے مقدمات میں ۴

(۲) دیگر حدود و قصاص کے مقدمات میں ۴

(۳) معاملات میں ۵

(۴) عورتوں کے مخصوص امور میں ۵

۵۔ قرآن و سنت میں شہادت کی اہمیت ۵

(۱) قرآنی تعلیمات ۶

(۲) تعلیمات نبوی ﷺ ۸

۶۔ گواہ کی اہلیت ۱۰

۷۔ عورت کی شہادت' ایک اہم مسئلہ ۱۱

(۱) حدود کے مقدمات میں گواہی ۱۲

(۲) معاملات میں عورت کی گواہی ۱۴

(۳) مستثنیات میں عورت کی گواہی ۱۵

۸۔ وہ لوگ جن کی گواہی غیر معتبر ہے ۱۶

(۱) محدود بالقذف ۱۶

(۲) غیر عادل ۱۷

(۳) غیر عاقل ۱۷

(۴) نابالغ ۱۸

(۵) نابینا ۱۸

(۶) گونگا ۱۹

(۷) نفع و نقصان میں شریک ۱۹

(۸) خائن ۲۰

(۹) جس کی گواہی جھوٹی ثابت ہو چکی ہو ۲۱

۹۔ جہاں ثبوت موجود نہ ہو ۲۱

۱۰۔ شہادت روزمرہ زندگی میں ۲۴

۱۱۔ مزید مطالعہ کے لیے ۲۵

۱۲۔ حواشی و حوالہ جات ۲۵

۱۳۔ مصادر و مراجع ۲۶

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا' بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کئے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم و فنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو' سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی' امام رازی' امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

دور جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی' یعنی فلسفہ' منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک' آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی نسبتاً" زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارہ میں فوری طور پر اپنے کو صف آراء کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی' دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید رد عمل اٹھتا نظر آرہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی رد عمل کا مظہروہ ولی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں' لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں' کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل' ایک فکری تبدیلی' ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی

انقلاب سے عبارت ہے - جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی' دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردان کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی ماخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جن کو رائج الوقت قانونی' دستوری' اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو' جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دور جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اوراسلامی تعلیم کے مراکزمیں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً" ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کاہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ملک میں نفاذاسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیش کش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصر مدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء ' طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جارہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان "ایڈوانس کورسز" کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارہ میں

"اسلامی نظام عدل و قضاء میں شہادت کا تصور" سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون کا انیسواں یونٹ ہے۔ اسلام کے نظام عدل کی یہ تیسری کڑی ہے۔ اس سے قبل سترہویں یونٹ میں عدل و قضاء کے بارہ میں کچھ بنیادی تصورات کا ذکر کرنے کے بعد اٹھارھویں یونٹ میں ایک نیم عدالتی ادارے "الحبہ" کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔

اسلامی قانون ہی پر کیا موقوف ہے' دنیا کے کسی بھی نظام میں قضاء کے عمل میں شہادت کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ وہ ذریعہ یا وسیلہ ہے جس سے فریقین اپنے اپنے حقوق سے متمتع ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن و سنت دونوں میں شہادت کی بابت اصولی راہنمائی کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر جزئیات بھی ملتی ہیں۔ احادیث کا ذخیرہ تو شہادت کے ہر گوشے پر راہنمائی فراہم کرتا ہے لیکن خود قرآن مجید میں بھی شہادت کے اساسی مسائل پر بنیادی راہنمائی موجود ہے۔ گواہی کی ضرورت و اہمیت' گواہ کے بعض اوصاف اور بعض مقامات پر اس کی اہلیت' یہ موضوعات قرآن مجید میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ شہادت ہی وہ سنگ اساس ہے جس پر نظام عدل کی عمارت قائم ہوتی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ اساس مضبوط ہو تو عمارت ------نظام عدل و قضاء------ بھی مضبوط ہوتی ہے اور اگر اساس کی تکوین و ترکیب کمزور ہو تو عمارت بھی ناپائیدار قرار پاتی ہے۔ دیکھنے میں دلکش ہو سکتی ہے لیکن اس کے زمین بوس ہونے میں زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔

زیر نظر یونٹ کی تیاری میں انہی مذکورہ بالا تصورات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ تمہیدی کلمات کے بعد حسب معمول شہادت کی فقہی تعریف کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نصاب شہادت بھی ہمارے بعض قانونی حلقوں میں بعض اوقات ہدف تنقید رہتا ہے۔ اس بابت بھی شہادت کی جملہ اقسام کو چار بڑی قسموں میں تقسیم کر کے ایک ایک کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ نصاب شہادت کے بارہ میں کسی الجھن کا امکان نہیں رہتا۔ قرآن و سنت میں شہادت کی اہمیت کن الفاظ میں وارد ہوئی ہے' یہ بھی ایک اہم عنوان ہے جسے یونٹ میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ گواہ کی اہلیت اور عورت کی شہادت ایسے دو اہم موضوعات ہیں دونوں موضوعات جن پر "جدید تقاضوں" کی دہائی دے کر بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ زیر نظر یونٹ میں ان دونوں موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کے بارہ میں بھی بعض الجھنوں کو رفع کیا جائے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کسی وجہ سے گواہی دینے کے لیے نااہل ہیں۔ عدالتی نظام سے ہٹ کر روزمرہ زندگی میں انسان قدم قدم پر غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے لیے گواہی دیتا رہتا ہے اور اسے گواہی کے زمرے میں لاتا ہی نہیں ہے۔ اس بابت بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ بھی مکمل گواہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے لوگوں کی زندگی پر مضر یا مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یونٹ کے آخر میں حسب قاعدہ بعض مفید کتب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ایک نظام عدل و قضاء ہی نہیں اسلامی نظام کا ہر ادارہ دنیا کے دوسرے ہر نظاموں سے الگ اور منفرد ہے۔ اس کا نظام قضاء ہی نہیں بلکہ اس کا نظام شہادت بھی ایک گونہ انفرادیت کا حامل ہے اس لیے اس کا مطالعہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے موجودہ یونٹ اسی سلسلہ کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قانون دان اصحاب کو یہ کوشش پسند آئے گی اور ہمیں ان کا تعاون، ان کی آراء اور تجاویز کی شکل میں حاصل ہو گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۶ جمادی الاخر ۱۴۱۸ھ

۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء

تمہید

گزشتہ ایک باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی معاشرے میں سب سے بڑا قاضی خود انسان کا اپنا ضمیر ہے جو بہت سے معاملات کا درست فیصلہ خود کرتا ہے۔ معاہدہ کی کسی شق کی تعبیر میں فریقین کے درمیان اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں قاضی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قاضی کے سامنے دونوں فریق اپنا معاملہ تمام حقائق کے ساتھ ٹھیک ٹھیک طریقے سے بیان کر دیتے ہیں جس کے بعد قاضی اپنے ایمان، علم اور بصیرت کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں بہت سادہ، سہل اور عام فہم ہیں لیکن عدل ہی کے ضمن میں ایک تیسری صورت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں ضد، عداوت، ہٹ دھرمی اور بدنیتی کے ساتھ قاضی کے سامنے معاملہ لے جائیں، حقائق چھپائیں، توڑ مروڑ کر پیش کریں، مبالغہ آرائی کریں، واقعات میں رنگ آمیزی کریں یا جذباتی فضا پیدا کر دیں۔ ان حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ فریقین کے علاوہ کسی تیسرے عنصر کو بھی شامل مقدمہ کیا جائے تاکہ قاضی کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو۔ تیسرا فریق گواہ کہلاتا ہے۔ گواہ کی ضرورت دوسری صورت میں بھی پیش آ سکتی ہے جہاں فریقین کے درمیان تعبیر میں فرق کی وجہ سے اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے، تاہم تیسری صورت میں تو گواہ بہت اہم ہے اور تمام مقدمے کا دارومدار گواہ کے بیان ہی پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل و قضاء میں گواہی کی از حد اہمیت ہے جس کے لیے باقاعدہ احکام نازل کیے گئے ہیں۔

اس باب میں اسلام کے نظام عدل و قضاء میں گواہی کی اہمیت، گواہ کے اوصاف، گواہی کے لیے نااہلیت اور روزمرہ زندگی میں گواہی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ آخر میں حسب معمول موضوع کے بارے میں تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات کے لیے مزید کتب کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔

وسائل فیصلہ

کسی مقدمہ میں فیصلہ کرنے سے قبل قاضی کو چار میں سے کوئی ایک، چند یا تمام ثبوت سامنے رکھنا پڑتے ہیں۔ ثبوت ہی وہ وسائل ہیں جن کے ذریعے مقدمہ کا فیصلہ ممکن ہے۔ ثبوت چار طرح کے ہوتے ہیں جن کا مختصر تعارف آئندہ سطور میں پیش نظر ہے۔ زیر نظر باب میں ان چار ثبوت میں سے ایک--- شہادت--- کا ذکر مطلوب ہے جس کا تفصیلی ذکر آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے۔ بقیہ تین ثبوت پیش نظر نہیں ہیں۔ ان کا اجمالی بیان ہی کافی ہے۔

اقرار:

اقرار میں (Confession) اور (Admission) دونوں شامل ہیں۔ جب کوئی عاقل بالغ شخص بقائمی ہوش و حواس اقرار کر کے کئے گئے کسی جرم کی قطعیت واضح کر دے یا کسی کا حق تسلیم کر لے تو قاضی کے لیے فیصلہ کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ اقرار کا وجود قرآن سے ثابت ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ (نساء، ۴:۱۳۵)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

قسم:

کسی مقدمہ میں متعلقہ فریق اقرار کرے نہ اس کے خلاف شہادت ہو تو اس سے قسم لی جا سکتی ہے۔ قسم بالعموم خود مجرم یا مدعا علیہ کی برات پر منتج ہوتی ہے۔ اس سے مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں ایک ثبوت ملتا ہے۔ حتمی فیصلہ کرنے کے لیے مقدمہ کی نوعیت کے مطابق کئی دوسرے امکانات بھی پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں۔ قسم کا ثبوت بھی قرآن میں ہمیں لعان کے مقدمہ میں ملتا ہے جس میں شوہر اپنی بیوی پر تہمت زنا لگائے اور چار گواہ مہیا نہ کر سکے تو اسے قسم اٹھانے کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تفصیلی احکام کے لیے کتب احادیث میں کتاب القضاء ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

قرائن:

قرائن (Circumstancial Evidence) قرینہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ ثبوت ہے جو کسی واقعہ کے بارے میں یقین دلا سکے یا یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ واقعہ اس طرح ہوا ہو گا۔ کسی مدہوش شخص کے بارے میں یہ اندازہ کرنا ابتدائی اور فوری انسانی رد عمل ہے کہ وہ نشے کی کیفیت میں ہے۔ منہ سے نشے کی بو بھی محسوس ہو رہی ہو تو اس ثبوت کی پختگی واضح ہو جاتی ہے۔ بو نہ ہو تو انسانی ذہن کسی دوسری طرف بھی سوچ سکتا ہے۔ مدہوش شخص کی عمومی شہرت اور ماضی پیش نظر رکھنا بھی قرائن میں سے ایک ہے۔ غیر معمولی اچھی شہرت کا حامل شخص مدہوش نظر آئے تو انسانی ذہن اسے طرح طرح کی رخصتیں دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ بدکار شخص مدہوش نظر آئے تو ہر دیکھنے والا فرد اسے لائق سزا سمجھتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں مدہوشی، شے کی مخصوص بو اور عمومی شہرت

تین قرائن ہیں۔

قرائن کے ذریعہ مقدمے کا فیصلہ کرنا قرآن سے ثابت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر جب عزیز مصر کی بیوی نے نعوذ باللہ زنا بالجبر کا الزام لگایا تو ظاہر بات ہے ملزم (؟) نے الزام کی صحت کا انکار کر دیا۔ اس پر ایک ذہین شخص نے یہ قرینہ بتایا کہ اگر اس ہاتھا پائی میں یوسف علیہ السلام کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو وہی مجرم ہے لیکن اگر قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو ملزم کا بیان درست ہے' مدعیہ جھوٹی ہے۔ اس عقلی پیمانے پر جب قمیض کو پرکھا گیا تو یوسف علیہ السلام سچے ثابت ہوئے (یوسف' ۱۲: ۲۹۔ ۲۳)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب آلات و اوزار میں بے پناہ تغیر واقع ہو چکا ہے اس لیے قرآئن بھی متنوع ہو چکے ہیں۔ اس بارے میں ایک مکمل فن (Forensic Science) معرض وجود میں آ چکا ہے جس کی کئی ذیلی شاخیں ذیلی فنون پر بحث کر کے عدالت کی مدد کرتی ہیں۔ پاؤں کے نشان' انگلیوں کے نشان' لیبارٹری ٹیسٹ' اسلوب تحریر' طبی معائنے یہ سب قرائن ہی کی شکلیں ہیں جن سے عدالت کو فیصلہ کرنے میں بخوبی مدد ملتی ہے۔

قرائن سے واقعات مقدمہ کا اندازہ کرنا بڑی بصیرت اور دانائی کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن احتیاط کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

شہادت کی تعریف

کسی متنازعہ معاملہ کو ثابت کرنے والے ذرائع ثبوت میں سے ایک ذریعہ ثبوت شہادت ہے' یہ ہماری عدالتی زندگی میں بہت معروف اور عام فہم اصطلاح ہے۔ لغت کی رو سے شہادت کے معنی "خبر قطعی" کے ہیں[۱]۔ شریعت کی اصطلاح میں شہادت کی ایک تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

اخبار صدق لاثبات حق بلفظ الشہادۃ فی مجلس القاضی[۲]

عدالت میں لفظ گواہی (کی تخصیص) کے ساتھ حق ثابت کرنے کے لیے سچی خبر دینا شہادت ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں بھی یہی تعریف کی گئی ہے' صرف مجلس القاضی کی جگہ مجلس القضاء کے الفاظ کا فرق ہے۔ یہ تعریف فقہی ہے اس لیے اس کے الفاظ کی ترتیب میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو اصطلاحی شہادت کے لیے ضروری ہیں۔ اس تعریف سے مندرجہ ذیل اہم نکات حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ شہادت سے مراد وہ سچی خبر ہے جو قاضی کے سامنے دی جائے۔ روزمرہ زندگی میں بولے جانے والے تمام سچ شہادت کی تعریف میں نہیں آتے۔

۲۔ "مجلس القاضی" کی ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی کے سامنے دی جانے والی شہادت بھی وہی مقبول ہے جو عدالت (مجلس القضاء) میں دی جائے۔ مجلس القضاء عدالتی عمل کو کہتے ہیں۔ عدالتی عمل سے ہٹ کر دی جانے والی شہادت کی کوئی اہمیت نہیں' چاہے وہ کہیں اور قاضی کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ گواہ کے کلام کو شہادت قرار دینا اور اس کی تخصیص کرنا ضروری ہے' اس لیے گواہ شہادت دینے یا اس کے مماثل الفاظ لازماً استعمال کرے۔

۴۔ گواہ کا بیان حق ثابت کرنے کے لیے ہو' نہ کہ حق چھپانے کے لیے۔ اگر حق کو چھپانے کے لیے ہو تو اس پر شہادت کی تعریف صادق نہیں آئے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ حق واضح کرنے والا یہ بیان سچا ہو۔

شہادت کے ضمن میں چار اصطلاحات کی ضرورت کثرت سے پیش آتی ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ شاہد' اسم فاعل کا صیغہ۔ وہ شخص جس نے مشاہدہ کیا ہو' مراد گواہ ہے۔

۲۔ مشہودلہ' وہ شخص جس کے لیے' یعنی جس کے حق میں شہادت دی جائے۔

۳۔ مشہود علیہ' وہ شخص جس پر' یعنی جس کے خلاف' شہادت دی جائے۔

۴۔ مشہودبہ' وہ معاملہ یا واقعہ جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہو۔

نصاب شہادت

نصاب شہادت سے مراد مختلف مقدمات میں گواہوں کی کم از کم مطلوب تعداد ہے۔ اس کا انحصار مقدمہ کی نوعیت پر ہے جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ حد زنا کے مقدمات میں

زنا کے مقدمات میں نصاب شہادت چار مرد گواہ ہیں۔ اس سے کم گواہوں کے ذریعے جرم کی قطعیت ثابت نہیں ہوتی۔ یہی اللہ کا فرمان ہے (نساء' ۴: ۱۵)۔ عورت کی گواہی سے حد ثابت نہیں ہوتی۔

۲۔ دیگر حدود اور قصاص کے مقدمات میں

باقی حدود اور قصاص کے مقدمات میں دو گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ممکن ہے کنزالدقائق میں آتا ہے۔

ولبقیۃ الحدود والقصاص رجلان [۳]

اور باقی حدود اور قصاص کے لیے دو گواہ (ضروری ہیں)۔

۳۔ معاملات میں

معاملات سے مراد نکاح، خرید و فروخت اور دوسرے تمام معاہدات و مقدمات ہیں۔ ان میں گواہی کا نصاب دو مرد گواہ ہیں یا ایک گواہ کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت بھی درست ہے۔ اس کی بنیاد سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ ہے۔

۴۔ عورتوں کے مخصوص امور میں

عورتوں کے مخصوص امور عام زندگی سے قدرے مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان میں ایک عورت کی گواہی سے نصاب مکمل ہوتا ہے، بچے کی ولادت میں ایک دائی کی شہادت کافی ہوتی ہے۔ کئی امراض اور مباشرت کے بارے میں فنی شہادت بعض اوقات ایک عورت کے ذریعے ممکن ہوتی ہے جو قابل قبول ہے۔

نصاب شہادت کے ان چاروں پہلوؤں پر فقہاء نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

حد زنا کے مقدمات میں چار گواہوں کا کڑا نصاب ہمارے قانونی حلقوں میں عام طور پر زیر بحث آتا ہے۔ یہ سخت نصاب دراصل برائی اور اس کے تذکرے کے سدباب کے لیے آخری کوشش ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ زنا کے خاتمے کے لیے اسلام پہلے تو کئی دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی زنا کا ارتکاب ہو ہی جائے تو اسے کثرت سے بیان کرنا اسلامی نظام عدل کا مشغلہ نہیں ہے بلکہ خالص اسلامی معاشرت میں اس طرح کے قبیح افعال کا بیان ہی ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے جس کا پورا ہونا قریب قریب محال ہے اور یوں زنا کا ذکر کرنا بھی آسان نہیں رہتا۔ عورتوں کی شہادت میں بھی بڑا منطقی ربط ہے۔ ایک طرح کے مقدمات میں ان کی گواہی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ دوسری قسم میں اسے ایک معاون عورت کی سہولت دی اور تیسری قسم کے مقدمات میں ایک عورت کی گواہی کو کافی سمجھا گیا۔

قرآن و سنت میں شہادت کی اہمیت

یوں تو قرآن و سنت میں گواہی کی ضرورت و اہمیت پر تفصیلی احکام ہیں جن کا ذکر موقع کی مناسبت سے کیا جائے گا لیکن انہی احکام کی روشنی میں خلفائے راشدین کے دور کے ایک مشہور قاضی شریح نے گواہی کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

فریق مقدمہ قاضی کے لیے بیماری ہے۔ اس بیماری کی دوا گواہ ہیں ۴۔

گواہی کی جو عام فہم اہمیت ان الفاظ میں ہے وہ مزید کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ دوا صحیح اور خالص اجزا سے تیار ہو تو بیماری دور ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ دوا کا انتخاب غلط ہو' مرض کے لیے غلط دوا حاصل کی جائے تو افاقہ نہیں ہوتا' یہی صورت مقدمہ میں پیش آتی ہے جو مرض ہے اس کی دوا گواہ ہیں۔ وہ سچ بولیں تو مقدمہ صحیح فیصلے پر منتج ہوتا ہے۔ سچ چھپائیں تو مقدمہ تو شاید کسی نہ کسی سطح پر ختم ہو جائے لیکن فریقین کے درمیان نہ نزاع ختم ہو گا اور نہ صحیح فیصلہ ممکن ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں گواہی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

قرآنی تعلیمات

قرآن و سنت دونوں میں شہادت کی اہمیت بہت زور دار الفاظ میں آئی ہے۔ قرآن میں ایک جگہ اللہ جل شانہ' نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (مائدہ' ۵:۸)

اے ایمان والو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔

اس آیت میں مومنین کی تربیت کی جا رہی ہے۔ مضمون سے پتا چلتا ہے کہ سچی گواہی کو ساری زندگی کا معمول بنا دینے کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ رویہ زندگی کے ہر میدان میں مطلوب ہے۔ اس آیت میں انسانی شخصیت کی تعمیر عدل کی بنیادوں پر استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عام زندگی میں ہر انسان عدل و انصاف کا دعوے دار ہوتا ہے لیکن جب اس کے اپنے قرابت داروں کا معاملہ ہو تو پھر وہ تامل کا رویہ بھی اپنا سکتا ہے۔ اس لیے ایک دوسری آیت میں گزشتہ آیت کے حکم کو مزید وضاحت سے بیان کیا گیا تاکہ انسان نہ صرف دوسروں کے معاملہ میں بلکہ اپنے قرابت داروں کی بابت بھی وہی کچھ بیان کرے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (انعام' ۶:۱۵۲)

اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ، ۲: ۴۲)

اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ مت ملاؤ اور جانتے بوجھتے حق کو مت چھپاؤ۔

گواہی کے بعد بڑا نازک اور اہم مرحلہ گواہی پر قائم رہنے کا آتا ہے۔ ممکن ہے ایک شخص گواہی دے اور بعد میں اس پر خاندان، قبیلے، ماحول یا کسی اور قسم کا دباؤ پڑے اور وہ گواہی سے منحرف ہو جائے، یہ دباؤ لالچ کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، اس کی ایک صورت دھمکی کی ہو سکتی ہے، اخلاقی دباؤ بھی ممکن ہے، اس کی کوئی اور شکل بھی ممکن ہے، ان تمام حالات میں ثابت قدمی بہت مشکل ہے۔ گواہ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ جو اس کے علم میں ہو، بلا کم و کاست بیان کر دے، فیصلہ قاضی پر چھوڑ دے اور نتائج اللہ کے حوالے کر دے۔ نہ تو اس کے نتائج پر فکر مند ہو اور نہ اس کے علاوہ سوچ بچار کرے۔ کیونکہ عدالتی زندگی میں گواہی ایک مکمل میکانکی عمل ہے جس میں جذبات کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم میں جنت میں رہنے والے جن افراد کا ذکر ہے ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سچی گواہی دینے والے اور اس پر قائم رہنے والے ہیں۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (معارج، ۷۰: ۳۳)

اور جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں۔

گواہی دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ اخلاقی، جس میں کسی شخص نے بلا ارادہ کچھ دیکھا یا اس کے علم میں کوئی بات آ گئی۔ اور اکتسابی، جس میں ارادے کے ساتھ کسی معاملہ میں آدمی شریک ہو کر مشاہدہ کرے، یا علم حاصل کرے۔ ان دونوں صورتوں میں ضرورت پڑنے پر گواہی دینا فرض ہے، انکار کرنا درست ہے اور نہ لیت و لعل کا رویہ اختیار کرنا اللہ کو پسند ہے۔ اس بارے میں تین احکام بہت اہم ہیں۔ پہلے گواہی کے بارے میں بنیادی بات کہی گئی کہ اس کا چھپانا گناہ ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ، ۲: ۲۸۳)

اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہو گا۔

یہ حکم گواہی کی تمام قسموں کا احاطہ کرتا ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ دوسری جگہ اتفاقی گواہی کے بارے میں حکم نازل ہوا۔ قرآن حکیم میں آتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (بقرہ، ۲: ۱۴۰)

اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جس کے ذمہ اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ

اسے چھپائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی کا عدل تو بہت بعد کی بات ہے، گواہ کا ابتداً گواہی چھپانا ہی عدل کے منافی ہے۔ گواہی کے چھپاتے ہی ظلم کا آغاز ہو جاتا ہے اور عقل کہتی ہے کہ اس ظلم کے نتیجے میں قاضی کا فیصلہ، ظاہر ہے غلط ہو گا جس کا ذمہ دار گواہی چھپانے والا ہے۔

دوسری گواہی اکتسابی یا بالارادہ ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ کا فرمان ان الفاظ میں ہے۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا (بقرہ، ۲: ۲۸۲)

جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔

یہ فرمان اللہ کی خواہش ہی نہیں، حکم بھی ہے۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۳ میں بیان ہوا ہے کہ جو گواہی چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہو گا۔

تعلیمات نبوی ﷺ

مذکورہ بالا قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کے لیے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں گواہی سے متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ہے۔ تعلیمات اسلامی میں بہترین گواہی وہ ہے جو بغیر طلب کئے دی جائے۔ ہمارے ہاں مقدمات میں بالعموم مدعی یا مدعا علیہ گواہوں کی خوشامد کر کے انہیں عدالت میں لاتے ہیں، ان کا سفر خرچ اور دن بھر کا خرچ بھی متعلقہ فریق کے ذمہ ہوتا ہے اور بسا اوقات تو گواہ درست اور سچی گواہی کے لیے نقد رقم کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ بعض حالات میں گواہوں کے ضروری اخراجات صاحب مقدمہ کے ذمہ ہو سکتے ہیں لیکن گواہی دینے کے لیے اجرت طلب کرنا غلط ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا میں تمہیں بہترین گواہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ یہ کہنے کے بعد آپؐ نے خود ہی فرمایا کہ "بہترین گواہ وہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دے دے"[۵]۔ یہ افضل گواہی کے بارے میں فرمان نبویؐ ہے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص طلب کرنے کے باوجود گواہی نہ دے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے جھوٹی گواہی دی ہو، اس میں اور جھوٹے گواہ میں کوئی فرق نہیں[۶]۔

گواہی چھپانے کے مساوی فعل جھوٹی گواہی ہے، جھوٹی گواہی دینا تو بہت ہی ناپسندیدہ فعل ہے جس کے بارے میں حدیث میں بڑے سخت الفاظ آئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لن تزول قدما شاهد الزور حتى يوجب الله له النار[۷]

جھوٹے گواہ کے قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے جب تک اللہ اس کے لیے جہنم واجب نہ کر دے۔

جھوٹا گواہ محض جہنمی ہی نہیں ہو گا جس کی نجات کی کوئی گنجائش موجود ہو بلکہ اس کا مقام مشرکین اور بت پرستوں کے ساتھ ہو گا۔ ترمذی کی ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر دوران خطبہ فرمایا کہ "جھوٹی گواہی شرک اور بت پرستی کے برابر ہے۔ اس لیے اس سے بچو"[۸]۔

گواہی وہیں دی جائے جہاں اس کی ضرورت ہو۔ نہ تو کتمان شہادت (گواہی کا چھپانا) درست ہے اور نہ جا بجا' موقع بموقع سنی سنائی بات کا ذکر مفید ہے۔ گواہی دینا یقیناً فرض ہے' گواہی' سچی اور بے لاگ ہو' یہ بھی ضروری ہے۔ گواہی بغیر طلب کیے دی جائے' یہ بھی حدیث ہی سے ثابت ہے لیکن گواہی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہی گواہی دی جائے جس کی ضرورت ہو۔ کہیں ٹریفک کے حادثے میں کوئی زخمی ہو' گاڑی کا ڈرائیور موقع سے گاڑی سمیت فرار ہو جائے۔ گواہ نے گاڑی کا نمبر درج کر لیا ہو تو یہاں از خود گواہی دینا فرض ہے تاکہ ملزم کو گرفتار کر کے اسے سزا دی جائے۔ اسی طرح کسی شخص نے نکاح کے بعد بوجوہ رجسٹریشن نہ کرائی بہت بعد میں کسی وجہ سے زوجین کا معاملہ عدالت تک جا پہنچا' نکاح میں قانونی شبہ پیدا ہو گیا ہو تو گواہوں کا فرض ہے کہ خود جا کر گواہی دیں۔ لیکن حدود کے مقدمات میں کوئی شخص گواہ ہو' اسے طلب بھی نہ کیا جائے اور وہ از خود جا کر کسی کے خلاف گواہی دے تو یہ جائز نہیں ہے۔ حدود کے مقدمات میں گواہی کا چھپانا زیادہ بہتر ہے' بہ نسبت اس کے کہ اسے ظاہر کیا جائے۔ اسی طرح سنی سنائی بات سے قیاس کر کے نتیجہ نکالنا' پھر اسے گواہی کی شکل میں پیش کرنا' یہ سب ناپسندیدہ افعال ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

من شهد على مسلم شهادة ليس لها باهل فليتبوا مقعده من النار[۹]

جس شخص نے کسی مسلمان کے خلاف کوئی ایسی گواہی دی جس کا وہ (قانونی طور پر) اہل نہیں تھا تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

گواہی کی اہمیت و فضیلت پر یہاں محض چند احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عنوان پر بکثرت احادیث موجود ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ گواہی بہت اہم فریضہ ہے' اس کا چھپانا گناہ ہے اور گواہی کو جھوٹ بنا کر پیش کرنا تو کھلی گمراہی ہے۔

گواہی کے بارے میں یہ احکام اس شخص کو سامنے رکھ کر نازل کیے گئے ہیں جو گواہی دے رہا ہو۔ گواہی دینا'

بروقت گواہی کا اہتمام، سچی گواہی دینا، اور حق کے مطابق گواہی دینا یہ سب گواہ کے ذمہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مقدمے کے دوسرے عناصر بھی نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔ فریق مقدمہ گواہ پیش کرے تو گواہ حقائق کو سچ سچ بیان کر دے۔ وکیل کا کام یہ نہیں کہ اس کے بیان میں رنگ آمیزی کرے، حقائق بدل ڈالے، اپنے دلائل کے مطابق گواہ کا بیان ترتیب دے، اسے وہ باتیں سکھائے جو فی الحقیقت درست نہ ہوں۔ وکیل کا کام یہ ہے کہ اپنے موکل کو درست قانونی مدد بہم پہنچائے اور نتائج کے بارے میں فکر مند نہ ہو۔ یہ نہ اس کی ذمہ داری ہے اور نہ اس سے اس بارے میں اللہ کے ہاں کوئی باز پرس ہو گی۔

گواہ کی اہلیت

اپنی اصل کی اعتبار سے تمام افراد کی گواہی درست ہوتی ہے، ماسوائے ان افراد کے جن کی سلبی فہرست قرآن و سنت میں موجود ہے۔ ایسے افراد کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ لوگ جنہیں افعال قبیحہ کی گواہی سے اللہ کریم نے اپنی شفقت سے بچا لیا ہو جیسے عورتیں۔

۲۔ دوسرے وہ لوگ جن کی گواہی نامعتبر ہو۔ یوں تو یہ افراد دس کے قریب ہیں لیکن انہیں چار بڑی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وہ لوگ جن کا کردار داغ دار ہو جیسے خائن کی گواہی نامعتبر ہے۔

(۲) وہ لوگ جن کا کردار تو بے داغ ہو لیکن کسی خاص معاملہ میں ان کی گواہی کا اعتبار نہ ہو، جیسے ذاتی ممنون احسان ملازم کی آقا کے حق میں گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

(۳) وہ لوگ جن پر کوئی ایسی عارضی کیفیت طاری ہو جو گواہی میں رکاوٹ ہو، جیسے بعض معاملات میں کم عمری کی وجہ سے بچے کی گواہی نامعتبر ہے۔

(۴) کسی ذہنی یا جسمانی نقص کے باعث، جس کا گواہی سے تعلق ہو، بھی گواہی نامعتبر ہے۔

ان کے علاوہ تمام افراد کی گواہی معتبر ہے۔

اسلامی قانون شہادت میں درحقیقت مجرد شہادت کا وجود نہیں ہے بلکہ اس کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو کے احکام الگ الگ ہیں۔ تمام قانون شہادت کا ایک ایک جزو دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔ کسی ایک حصے کے بارے میں مطالعہ کر کے تمام نظام کے متعلق رائے قائم کرنا نہ صرف درست طریقہ نہیں ہے بلکہ اس سے نکالا گیا غلط نتیجہ گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ گواہی کے تمام نظام کا مطالعہ کر کے ہی کوئی رائے قائم

کی جائے۔ آئندہ سطور میں مذکورہ بالا افراد کے بارے میں وضاحت پیش کی جا رہی ہے۔

عورت کی شہادت، ایک اہم مسئلہ

عصر حاضر میں عورت کی گواہی کو بوجوہ ایک پیچیدہ مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ مسئلہ قرآن حکیم کی ایک آیت پر کھڑا کیا گیا کہ "اپنے معاملات میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا کرو"۔ دوسری اسلامی تعلیمات کو نظرانداز کر دیا گیا اور محض ایک آیت پڑھ کر عورت کی شخصیت ہی آدھی قرار دی گئی۔ اتفاق سے بعض میتوں کے ترکے میں عورت کا حصہ اپنے بالمقابل کے مرد کے مقابلے میں بوجوہ نصف ہوتا ہے۔ یہ دونوں نکات جمع کر کے ایک مفروضہ قائم کیا گیا کہ عورت کے حقوق اسلام میں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ پھر اس مفروضے کو مختلف ذرائع اور جدید تشہیری وسائل سے عام کیا گیا اور آخر میں مطالبہ کیا گیا کہ اس بارے میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

یہ سب کچھ دراصل اسلامی تعلیمات کو بطور کل نہ لینے کا نتیجہ ہے۔ اسلام کے کسی ایک جزو کو کل سے جدا کر کے اور اس کے سیاق و سباق سے ہٹا کر نتیجے پر پہنچنا چاہیں گے تو الجھن پیدا ہو گی۔ شراب کی حرمت ہی کو لیجئے۔ یہ تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ اب کوئی شخص ابتدائی آیت کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرے کہ شراب میں نقصان تو زیادہ ہے لیکن چونکہ نفع کا ذکر بھی ہے اور حرمت بھی نہیں ہے اس لیے اس کے استعمال میں کچھ زیادہ مضائقہ نہیں ہے۔ یا اگلی آیت کو لیا جائے تو اور بھی آسانی نظر آتی ہے کہ یوں تو شراب پی جا سکتی ہے مگر نماز ادا کرتے وقت ایسا کرنا ممنوع ہے۔ مگر کیا یہ سب کچھ درست ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ جو شخص بھی ان احکام کو جدا جدا پڑھے گا اس کی الجھن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اگر وہ سمجھنے کی غرض سے ایسا کرتا ہو تو شاید اسے کوئی راہ دکھائی دے لیکن اس نے پہلے سے کوئی مفروضہ قائم کر کے اسلامی احکام کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی گمراہی بڑھتی چلی جائے گی، (یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا[۹] اسی قرآن سے بہت سوں کو گمراہی حاصل ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے کئی لوگ فوز و فلاح پاتے ہیں)۔

یہی کچھ عورت کی گواہی کے معاملے میں ہوا۔ لیکن تمام تعلیمات اسلامی کا بطور کل مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو عورت کی گواہی آدھی ہے، نہ اس کی شخصیت آدھی ہے، اور نہ اسلامی احکام میں عورت کی گواہی کبھی کوئی مسئلہ رہا ہے بلکہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ اصحاب جب بھی اس نوع کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر جدید معاشرت ہوتی ہے جس پر وہ اسلامی احکام چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے رسوم و رواج کو وہ اسلام گردانتے ہیں۔ اصل قرآن و سنت کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا دوسرا

المیہ ہے کہ بسااوقات وہ رائج الوقت اصطلاحات کے مطابق ایک شے کو انسانی حقوق میں شمار کرتے ہیں جبکہ ذرا غور کیا جائے تو وہ حق کی بجائے طوق ہوتا ہے جسے گلے میں ڈالنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا' گواہی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ گواہی کی جملہ صورتیں تین اقسام میں بیان کی جا سکتی ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ حدود کے مقدمات میں

۲۔ معاملات میں

۳۔ کچھ مستثنیات میں

حدود کے مقدمات میں گواہی

حدود کے مقدمات میں عورت کی گواہی کا مرتبہ اور مقام سمجھنے سے قبل حدود کی تفہیم ضروری ہے۔

اسلامی معاشرت میں عدل و انصاف کی بلاشبہ بڑی اہمیت ہے اور حق دار کی داد رسی کے لیے اسلام کے سیاسی نظام میں کئی ادارے کام کرتے ہیں لیکن اسلامی معاشرت میں یہ بات قطعاً مستحسن نہیں ہے کہ اس کی عدالتیں مقدمات سے معمور ہوں۔ لوگ کوئی مفید کام کرنے کی بجائے عدالتوں کے چکر لگاتے پھریں۔ بلکہ ریاست بحیثیت کل وہ حالات پیدا کرتی ہے کہ حدود کو پامال کرنا ہی بے حد دشوار ہو جائے۔ مثلاً شراب نوشی کے مرتکب پر حد نافذ ہوتی ہے' یہ آخری چارہ کار ہے۔ اس سے قبل شراب کی تیاری' نقل و حمل' تجارت' لین دین' سب کچھ ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص شراب پی لے تو عدالتی عمل میں ایسی ایسی گنجائش رکھی گئی ہیں ملزم پر حد نافذ نہ ہو۔ عورت اور مرد کے ناجائز تعلق پر مبنی بدکاری ہی کو لیجئے۔ جس سے قبل بہت سے مراحل ہوتے ہیں جن کا اسلامی معاشرت میں مکمل سدباب کر دیا جاتا ہے۔ محرم نامحرم کی تفریق' آزادانہ اختلاط کی بیخ کنی' پردے کے احکام' عورت پر معاش کی ذمہ داری کا ارتفاع تاکہ پردے کا سوال بھی بعد میں اٹھے' نوعمری میں بروقت شادی کرا دینے کے لیے والدین کو ترغیب اور عائلی نظام کا ہر ممکن تحفظ اور اسلامی معاشرت کو پروان چڑھانے کے لیے کوششیں' یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان تمام کڑے مراحل سے گزر کر کہیں حرام کاری ہو جائے تو بھی قرآنی تعلیمات کے مطابق علانیہ اور پوشیدہ فحاشی کے قریب بھی نہ جانے کی تلقین موجود ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق فحاشی کے تذکرے' زبان کا چٹخارہ لینے کے لیے جا بجا گفتگو اور ذہنی تلذذ کی ممانعت ہے۔ کوئی شخص اللہ کے ممنوعات کی ان حدود کو بھی عبور کر جائے تو اس کے مضر ذکر سے معاشرے کو بچانے کا بھی اہتمام کر دیا گیا ہے اور اگلے مرحلے پر قذف کی سزا وضع کی گئی۔ تمام معاملات دو عادل گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوتے ہیں لیکن یہاں

اس فعل بد کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اس کو مزید چھپانے کا اہتمام ہے۔ حتیٰ کہ آخری چارہ کار کے طور پر عورتوں کو ان قبیح افعال کی گواہی کی سرے سے زحمت ہی نہیں دی گئی تاکہ معاشرے میں برے افعال کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو۔

گواہی فی الاصل ایک طوق ہے۔ کوئی شخص عام حالات میں بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا' چہ جائیکہ مومن مسلمانوں کی گھردار عورتیں افعال قبیحہ کی جزئیات عدالتوں میں مکمل تفصیل سے بیان کریں۔ ذرا تصور کریں کہ عائلی عدالتوں اور عائلی مقدمات میں کبھی کسی عورت کو عدالت میں پیش ہونا پڑے تو اسے کن کن سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فطری حیا کے باعث جدید دور کی عورت بھی ایسے سوالات کے جوابات دینے سے کتراتی ہے۔ گھردار عورتیں تو مردوں کا سامنا کرنے ہی سے کتراتی ہیں۔ اس حالت میں اور ان مقدمات میں ایسی گواہی کیا عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر سکتی ہے؟

بعض جدید تعلیم یافتہ اصحاب گواہی کو عورت کے "حق" سے منسوب کرتے ہیں اور حدود میں گواہی سے عورت کے استثناء کو اس کی شخصیت سے جوڑ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں عورت کے حقوق مردوں سے کم ہیں۔ ان کی یہ "اصولی اور علمی گفتگو" بظاہر بڑے مضبوط دلائل سے مزین ہوتی ہے۔ حالانکہ انہی علمی اور اصولی نکات کی تطبیق عمل کے میدان میں کی جائے تو مسلم معاشرے کے شاید ایک فی لاکھ افراد بھی اپنی خواتین کو بداخلاقی کے ان مقدمات میں گواہی دینے کے لیے عدالتوں اور پولیس تھانوں کے چکر نہ لگوائیں اور خود خواتین بھی اس کے لیے تیار نہ ہوں۔ ایک ہی معاملہ میں لوگوں کے اصولی اور عملی رویے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ یقین کیجئے' انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے بھی اپنی خواتین کو عدالت میں کبھی نہیں بھیجیں گے۔

فقہاء نے شہادت کے سلسلے میں حدود کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ اولاً زنا کی شہادت ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کی متفقہ رائے ہے کہ زنا کے مقدمہ میں عورت کی شہادت کی بنیاد پر حد جاری نہیں ہو گی۔ ان ائمہ کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (نساء' ۴: ۱۵)

اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیبیوں میں سے' تو تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنے میں سے گواہ کر لو۔

یہ ابتدائی حکم تھا جس میں گواہی کا نصاب تو موجود ہے لیکن آیت کے اگلے حصہ میں انتظار کرنے کے لیے

کہا گیا تھا۔ بعد میں اس جرم میں گواہی کا نصاب مقرر کر کے نصاب پورا نہ ہونے پر باقاعدہ سزا بھی مقرر کی۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً (نور، ۲۴: ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لا سکیں تو ایسے لوگوں کو اسی درے لگاؤ۔

فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے زنا کے مرتکبین کے لیے یہ ایک رعایت ہے کہ پہلے تو دو کی بجائے چار گواہوں کا وجود لازمی قرار دیا، پھر عورتوں سے یہ بار ہٹا کر ان کو بھی مشکل سے نکالا۔ یہی وجہ ہے کہ چاروں فقہی مسالک زنا کے مقدمات میں صرف مردوں کی گواہی ہی پر حد جاری کرتے ہیں۔ رہی عورت کی شہادت تو وہ مکمل اور جامع تو ہے لیکن حدود کے مقدمات میں اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی۔

بعض فقہاء نے اس کے برعکس بھی رائے دی ہے جن کی تعداد بہت قلیل ہے لیکن مجموعی اسلامی تعلیمات کی روح کے مطابق یہ رائے زیادہ صائب ہے کہ زنا کے مقدمات میں عورت کو نہ زحمت دی جائے۔ زنا کے علاوہ دوسری حدود اور قصاص میں بھی شہادت کی نازک ذمہ داری عورت کے ناتواں کندھوں پر نہیں ڈالی گئی۔

معاملات میں عورت کی گواہی

زنا، باقی حدود اور قصاص کے بعد روزمرہ کے معاملات میں گواہی کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ یہاں دو مردوں کی گواہی کافی ہے جو دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں سے گواہی مکمل ہو جاتی ہے۔ معاملات میں عورت کی گواہی مقبول ہے لیکن اسلامی معاشرے میں عورت کی تکوین میں حیا اور شرم اولین عناصر ہیں جن کے باعث مسلمان عورتیں مردوں کا سامنا کرتے وقت جھجک محسوس کرتی ہیں، اس کا اثر مقدمے کی کارروائی پر بھی پڑتا ہے، اس لیے اسلام عورت کو ایک سہولت مہیا کرتا ہے کہ کسی معاملہ میں گواہ بناتے وقت اسے ایک معاون عورت بھی فراہم کرتا ہے تاکہ دوران مقدمہ میں ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ اس دوسری عورت کی گنجائش بھی بھول کی صورت میں ہے، ورنہ فی الاصل ایک ہی عورت کی گواہی کافی ہے۔ اس کے برعکس دنیا کے دوسرے تمام نظام عورت کو اس طرح کی کوئی سہولت فراہم نہیں کرتے۔ وہ عورت کو بس عدالت میں لا کھڑا کرتے ہیں پھر سوال جواب میں کوئی دوسرا نہیں بول سکتا، جرح کے دوران میں مخالف وکیل کے تند و تیز سوالات کا وہ کیسے سامنا کرے؟ قانون اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عورت کو یہ ایک بہت بڑی سہولت فراہم کی ہے جس کو بعض لوگ

عورت کے "بنیادی حقوق" سے متصادم سمجھتے ہیں۔ اپنے دائیں بائیں دیکھ لیجئے عام گھریلو عورتیں ادھر ادھر جاتے وقت اپنے ساتھ کسی دوسری عورت کو لازماً لے کر جاتی ہیں۔ یہی حالت شارع نے گواہی میں مدنظر رکھی ہے۔

مستثنیات میں عورت کی گواہی

زندگی کا ایک دائرہ ایسا بھی ہے جس میں بالعموم مردوں کی گواہی کا سرے سے امکان ہی نہیں ہوتا اس لیے ان کی گواہی کا سوال ہی بے معنی ہے (یاد رہے کہ گواہی کے بارے میں یہ ساری بحث اسلامی معاشرت کے حوالے سے ہو رہی ہے نہ کہ جدید تمدن کے ضمن میں۔ اس لیے تمام احکام اسی تناظر میں ذہن نشین کرنا ضروری ہیں)۔ کسی عورت کے حاملہ ہونے نہ ہونے کی گواہی عورت ہی دے سکتی ہے۔ وضع حمل کے وقت بچہ زندہ پیدا ہوا اور پیدا ہوتے ہی مرگیا یا پیدا ہی مردہ ہوا تھا' یہ بھی عورت کی ایک گواہی کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔ عورتوں کے جسمانی پوشیدہ عیوب کے بارے میں ایک عورت کی گواہی کافی ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ محض ایک عورت کی اس گواہی پر' کہ اس نے زوجین کو اپنا دودھ پلایا ہے' زوجین میں تفریق کرا دی۔

ایسے تمام امور میں صرف عورت کی گواہی قابل قبول ہے۔ یہ گواہی کسی عورت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

نتیجہ بحث یہ حاصل ہوا کہ گواہی کے سلسلے میں شریعت نے تین دائرے وضع کیے ہیں۔

۱۔ پہلا دائرہ زنا کے مقدمات کا ہے۔ ان مقدمات میں اسلام اپنی عورتوں کو یہ زحمت ہی نہیں دیتا کہ قبیح افعال کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھیں اور پھر عدالتوں میں بے شمار دوسرے لوگوں کے سامنے اسے بیان بھی کریں۔

۲۔ دوسرے دائرے میں جملہ معاملات آتے ہیں۔ اس میں بالعموم دو مردوں کو گواہ بنایا جانا چاہیے۔ دو مرد دستیاب نہ ہو سکیں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ یہاں بھی دراصل گواہی تو ایک ہی عورت کی ہے دوسری عورت کا وجود صرف اس لیے ہے کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ دوسری عورت کا وجود ضروری ہے۔ یہاں بھی عورت کو گواہی جیسے مشکل مرحلے سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۳۔ تیسرے دائرے میں صرف عورتوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ یہ عورتوں سے متعلق مسائل پر مبنی دائرہ ہے اس میں تو مردوں کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ مردوں کے برعکس یہاں صرف ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

گواہی کے مسئلہ کو "بنیادی انسانی حقوق" یا عورت کی شخصیت سے وابستہ کرنے سے پہلے مکمل اسلامی معاشرے کا تصور بے حد ضروری ہے' اس کے بغیر محض چند احکام پڑھ کر جدید تمدن پر ان کو منطبق کرنا سوائے الجھن پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ ہر تمدن کو بطور کل لینے ہی سے اس کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ عورت کی گواہی کے بارے میں اگر چند استثنائی احکام وارد ہوئے ہیں تو بالکل وہی صورت حال ایک دوسرے دائرے میں مرد کے بارے میں بھی موجود ہے۔ ایک صورت میں عورت کی گواہی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے بلکہ بغیر کسی مفروضے کے اسلام کے نظام شہادت کا مطالعہ کیا جائے تو ایک عقدہ یہ بھی کھلتا ہے کہ ان معاملات کا وقوع اسلامی معاشرت میں بہت کم ہوتا ہے جہاں عورت کی گواہی پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے لیکن جہاں صرف عورت کی گواہی پر فیصلہ ہوتا ہے اور مرد کی گواہی کا سرے سے امکان ہی نہیں ہے وہ بہت زیادہ ہیں اور روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی نظام شہادت کی روح کا تمام جزئیات کے ساتھ مطالعہ کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے نہ کہ جدید دنیا کے بے مقصد مباحثے کو اسلام کے قانون شہادت سے منسلک کیا جائے۔

یہ صورت صرف اسلام ہی کے ساتھ نہیں' دنیا کا کوئی بھی نظام لے لیجئے' اس کے جملہ اعضاء باہم جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک عضو کو الگ کر کے نتیجہ نکالنے سے سارے نظام کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

وہ لوگ جن کی گواہی غیر معتبر ہے

قرآن و سنت اور کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افراد کی تعداد نو ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی گواہی کلی طور پر غیر مقبول ہے۔ وہ بھی جو اگرچہ عادل تو ہیں لیکن کسی خاص معاملہ میں گواہی کے اہل نہیں' باقی معاملات میں عادل گواہ شمار ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی گواہی تو ہر معاملہ میں غیر مقبول ہے لیکن عارضی کیفیت دور ہو جانے سے وہ بھی باقی لوگوں کی طرح گواہی کے اہل ہیں۔ یہ نو اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ محدود بالقذف

محدود بالقذف سے مراد وہ شخص ہے جس نے کسی مسلمان پر زنا کی تہمت لگائی اور چار گواہ مہیا نہ کر سکا اور اس پر حد قذف جاری کی گئی ہو۔ ایسے شخص کے بارے میں قرآن حکیم کا حکم یہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا

تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (نور، ۲۴: ۴، ۵)

اور وہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔ سوائے ان کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت سے یہ واضح ہے کہ توبہ سے قذف کی سزا ختم نہیں ہوتی کیونکہ قاذف کی زبان درازی سے کسی کی جتنی کردار کشی ہونا تھی وہ ہو چکی۔ شہادت کے بارے میں احناف کا کہنا ہے کہ توبہ کے بعد بھی اس کی شہادت قابل قبول نہیں۔ باقی تینوں امام کہتے ہیں کہ توبہ کے بعد شہادت قابل قبول ہو گی کیونکہ "الا الذین تابوا" سے مراد وہ لوگ ہیں جو توبہ کر لیں لہٰذا "الا" کا استثناء ظاہر کرتا ہے کہ ان کی شہادت قابل قبول ہے۔ ادھر احناف کی دلیل ہے کہ شرط (الا) کی جزا فان اللہ غفور رحیم میں موجود ہے۔ "جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اللہ یقیناً غفور رحیم ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ اب معاملہ ان کے اور اللہ کے درمیان ہے۔ رہی شہادت تو وہ پچھلی آیت کے لفظ "الا" کی روشنی میں قابل قبول نہیں۔ تفصیل کتب تفسیر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۲۔ غیر عادل

عادل سے مراد وہ شخص ہے جو روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر دیندار، راست باز اور نیک سیرت ہو۔ فی الاصل تمام مسلمان عادل ہوتے ہیں، سوائے ان کے جن پر قذف کی حد نافذ ہو چکی ہو، بدکردار اور بدنام افراد عادل نہیں کہلاتے، چاہے وہ سزا یافتہ ہوں یا نہ ہوں۔ عادل کی شرط سورہ مائدہ کی آیت ۱۰۶ میں ملتی ہے۔ "ذوا عدل منکم" سے مراد مسلمان عادل گواہ ہیں۔ دوران مقدمہ میں قاضی کا فرض ہے کہ گواہ کی ظاہری حالت کے پیش نظر اسے عادل قرار دے اور بالعموم لوگوں کی گواہی قبول کرے لیکن کسی مقدمہ میں فریق مخالف مطالبہ کرے کہ گواہ کے بارے میں تعدیل و تزکیہ ہو تو قاضی گواہ کے کردار پر بحث مباحثہ کرا سکتا ہے۔ اپنی صوابدید پر کسی کو عادل قرار دے تو وجہ بتائے۔

۳۔ غیر عاقل

عقل بھی گواہی کی شرائط میں سے ایک ہے۔ عقل سے مراد انسان کی عام متوازن ذہنی حالت ہے جس کے تحت عام انسان اپنے افعال سرانجام دیتے ہیں۔ عقل میں فتور آ جائے تو ذہنی حالت متوازن نہیں رہتی اور اشیاء،

واقعات اور حالات کا مشاہدہ اس طرح نہیں ہوتا جیسے ہونا چاہیے۔ اس لیے غیرعاقل کی گواہی نامعتبر ہے۔

۴۔ نابالغ

بلوغت کے لیے اسلامی قانون میں دو شرائط ہیں' یا تو بچہ اٹھارہ سال کا ہو جائے یا اس سے قبل وہ اس جسمانی تبدیلی سے گزر چکا ہو جس کی بناء پر کسی کو بالغ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں' یا ایک شرط پوری ہو تو بچہ بالغ قرار پاتا ہے اور اس کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے۔ بالغ نہ ہو' لیکن بلوغت کی علامات ظاہر ہو چکی ہوں اور قاضی کے خیال میں وہ گواہی کے لیے ضروری فہم رکھتا ہو تو اس کی گواہی بھی قبول کی جائے گی۔ اس کے علاوہ تحمل شہادہ کے وقت (مشاہدہ کرتے وقت) نابالغ ہو تو بالغ ہونے پر شہادت دینا کے اہل ہے۔ نابالغ کی گواہی کا معاملہ ہمہ جہت ہے۔ اس کا انحصار حالات و واقعات پر ہے اور اس کا فیصلہ قاضی کے ذمہ ہے کہ کس حالت میں کس عمر کے بچے کی شہادت کس حد تک مقبول ہو سکتی ہے۔ البتہ بہت سے طے شدہ امور میں نابالغ کی گواہی غیرمقبول ہے۔ تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۵۔ نابینا

نابینا کی گواہی غیرمعتبر ہے کیونکہ بغیر دیکھے کسی شے یا واقعہ کے بارے میں کچھ کہنا فریقین کے دعوے کو بری طرح متاثر کر سکتا ہے۔ اسی طرح بینا شخص کی وہ گواہی بھی قابل قبول نہیں جو سنی سنائی (Hearsay) بات پر مبنی ہو۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اے ابن عباسؓ! اگر کبھی تم گواہی دینے لگو تو صرف اسی چیز کی گواہی دینا جو تمہارے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو" اس کے بعد آپ نے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "جس طرح اس سورج کی روشنی آ رہی ہے"[۱]۔

یہ حدیث دونوں اشخاص کا احاطہ کرتی ہے۔ بصارت والا شخص اگر واقعہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تو اس کی گواہی غیرمقبول ہے اور نابینا شخص کے سامنے واقعہ پیش آ رہا ہو تو اس کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے۔ یہ حکم خاص اس واقعہ کے لیے ہے جسے دیکھ کر ہی گواہی دینا ضروری ہو۔ کئی واقعات اور معاملات میں آنکھوں سے دیکھنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ سنی سنائی معلومات پر تکیہ کر کے گواہی دینا جائز ہے اور ایسی گواہی نابینا کی طرف سے بھی قابل قبول ہو سکتی ہے۔ کسی بستی میں ایک نابینا نے عمر کا بڑا حصہ گزارا ہو' وہاں کے بچے بچے سے واقف ہو تو اس کی گواہی بہت سے امور میں قابل قبول ہو سکتی ہے۔ کس شخص کی شادی کب ہوئی' اس کے کتنے بچے ہیں' کس بچے کا باپ کون ہے' کسی خاص شخص کی عام شہرت کیسی ہے' یہ وہ امور ہیں جن کا دیکھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ سننا ہی

کافی ہوتا ہے۔ اس لیے ان میں نابینا کی گواہی قبول کی جائے گی۔ اسی طرح نابینا کی وہ شہادت بھی قابل قبول ہے جس کا مشاہدہ اس نے بینائی کے عرصہ میں کیا ہو۔ اور بعد میں بصارت کھو بیٹھا ہو۔

۶۔ گونگا

اندھے کی طرح گونگے کی شہادت بھی ہمہ پہلو ہے۔ لیکن دیکھنے کے اعتبار سے اندھے کی شہادت سے ذرا مختلف ہے۔ اندھا تو سرے سے کسی واقعہ کا مشاہدہ ہی نہیں کر سکتا' اس لیے اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہوتی لیکن گونگا دیکھنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے۔ دیکھ کر اس کا اظہار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے اس کی شہادت اندھے ہی کی طرح ہے۔

حدود کے مقدمات میں گونگے کی شہادت غیر مقبول ہے کیونکہ ان مقدمات میں گواہی اور جرح کا عمل گونگے کے حسب حال نہیں ہوتا۔ قاضی ذرا ذرا سی جزئیات سننے اور جرح کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتا ہے ایک ایک لفظ تشریح کا تقاضا کرتا ہے' تب جا کر وہ فیصلہ کن رائے دینے کے قابل ہوتا ہے۔ گونگے کی شہادت میں واقعہ کا کوئی پہلو تفصیل اور جزئیات کے ساتھ سامنے نہیں آ سکتا اس لیے حدود کے مقدمات میں گونگے کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ باقی مقدمات میں اگر گونگے کے علاوہ دوسرے معتبر گواہ مل جائیں تو ان کو ترجیح دی جائے اور گونگے پر انحصار نہ کیا جائے۔ پھر بھی کوئی گواہ نہ ملے تو گونگے کی گواہی پر احتیاط کے ساتھ انحصار کرنا درست ہے' وہ بھی اسی صورت میں کہ قاضی اور فریقین اس کے اشاروں سے کچھ سمجھ لیں اور ابہام نہ ہو۔ گونگے ہی کی شہادت پر انحصار کرتے ہوئے مقدمے کا فیصلہ کرنا بہت احتیاط اور خدا ترسی کا تقاضا کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ گونگے کے ساتھ کوئی دوسرا سلیم الاعضاء فرد بھی شامل ہو جو اس کی تائید کرے۔ اس صورت میں یہ گواہی درست ہے۔

۷۔ نفع و نقصان میں شریک

فریقین مقدمہ کی طرف سے پیش ہونے والے گواہ جن کا نفع و نقصان کسی ایک فریق سے وابستہ ہو' باہم الفت و محبت ہو' کینہ و عداوت ہو' ان کی گواہی اس خاص مقدمہ میں قابل قبول نہیں ہے۔ اس اصول کا اطلاق بہت سی حالتوں پر ایک دوسرے کے لیے ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی ایک دوسرے کے لیے گواہی' اولاد کی والدین کے لیے اور اس کے بالعکس' آقا اور ملازم کی گواہی' ممنون احسان شخص کی گواہی' شراکت و مضاربت میں شریک افراد کی گواہی' خاندانی دشمنی رکھنے والے افراد کی ایک دوسرے کے بارے میں گواہی' یہ سب ناقابل قبول ہیں۔ اس کی وجہ سیدھی سادی ہے' جب کسی فریق کے نفع و نقصان سے گواہ کا سود و زیاں منسلک ہو جائے تو گواہی متاثر ہوتی

ہے۔ دشمن کی صحیح بات کو بھی گواہ غلط ثابت کرنے کی کوشش میں غلط بیانی کر سکتا ہے تاکہ اسے نقصان پہنچا کر تسکین حاصل کرے۔ محبت ہو تو گواہ کے حسی و غیر حسی مفادات فریق مقدمہ کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اس لیے ان کے تحفظ کی کوشش میں گواہ اعتدال کا دامن چھوڑ سکتا ہے۔ اسلامی شریعت نے اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے ایسی تمام شہادتوں کو غیر معتبر قرار دیا۔ حدیث میں آتا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رد شہادۃ الخائن و الخائنۃ و ذی الغمر علی اخیہ و رد شہادۃ القانع لاھل البیت و اجازھا لغیرھم' قال ابو داود الغمر الحقد والشحناء' والقانع الاجیر التابع مثل الاجیر الخاص"

رسول اللہ ﷺ نے خیانت کار مرد اور خیانت کار عورت کی گواہی کو مسترد فرمایا۔ آپ نے کینہ و دشمنی والے شخص کی گواہی کو بھی اپنے اس بھائی کے خلاف جس سے کینہ و دشمنی ہو' مسترد فرمایا۔ آپ نے دست نگر شخص کی گواہی کو بھی ان گھر والوں کے حق میں مسترد فرمایا جن کا وہ دست نگر ہے۔ ہاں! دوسرے کے حق میں دست نگر کی گواہی کو آپ نے جائز قرار دیا۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ (اس حدیث میں لفظ) غمر سے مراد کینہ اور دشمنی ہے اور قانع سے مراد وہ ملازم ہے جو ذاتی ملازم کی طرح بالکل تابع ہو۔

اس مضمون سے ملتا جلتا مفہوم ابوداؤد کی چند دوسری احادیث میں بھی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث عمرو بن شعیب سے مروی ہے' انہی سے مروی ایک اور حدیث میں زانی اور زانیہ کی شہادت بھی ناقابل قبول ہے۔ باقی مفہوم تقریباً وہی ہے۔ اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث بھی ملتی ہے جس میں لفظی تغیر کے ساتھ تقریباً وہی مضمون ہے[۱۲]۔

۸۔ خائن

مذکورہ بالا احادیث میں جن افراد کی گواہی غیر مقبول قرار دی گئی ہے ان میں خائن (خیانت کرنے والا) اور خائنہ بھی شامل ہیں۔ خائن وہ شخص ہے جو امانت میں خیانت کرے۔ کوئی شخص اس کے پاس کوئی شے بطور امانت رکھے تو وہ اس میں سے کچھ لے لے' ساری شے غائب کر کے بہانہ سازی کرے' یا اعلیٰ معیار کی اشیاء نکال کر گھٹیا اشیاء رکھ دے' یہ سب خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

اس طرح وہ سرکاری اہل کار بھی خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں جو سرکاری رقوم یا اثاثوں میں خرد برد کرتے ہیں۔

اس کی کئی صورتیں ہیں جن کی روح یہی ہے کہ جس رقم یا اثاثے پر اہل کار کو تصرف کے اختیارات حاصل ہوں اور وہ انہیں بروئے کار لاتے ہوئے رقم یا اثاثے میں غبن کرے تو وہ خائن ہے۔ جرم ثابت ہونے پر ایسے شخص کی گواہی ناقابل قبول ہے۔

۹۔ جس کی گواہی جھوٹی ثابت ہو چکی ہو

وہ شخص جس نے کبھی گواہی دی ہو اور وہ جھوٹی ثابت ہوئی ہو' دوبارہ اس شخص کی گواہی مقدمے میں قابل قبول نہیں ہو گی۔ کیونکہ اس کے بارے میں ایک دفعہ علم ہو چکا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ کسی ایسے شخص کی گواہی بھی ناقابل قبول ہے جس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے (ولا مجرب شہادۃ زور)[۱۳]۔

منفی فہرست میں شامل ان نو افراد کے علاوہ کتب فقہ میں بہت سے ایسے افراد کی تفصیل بھی ہے جو انہی دس اقسام کی وضاحت ہے۔ مثلاً گویے' ناچنے گانے والے' آلات موسیقی بجانے والے' گناہ کبیرہ کے مرتکب' رشوت لینے والے' سود خوار' جواری' بلاعذر تارک نماز' جانور لڑانے والے' ہجو گو شاعر اور نشہ باز۔ ان میں سے بہت سے لوگ غیر عادل کی تعریف پر پورا اترتے ہیں' اس لیے ان سب کی تفصیل ضروری نہیں ہے کیونکہ غیر عادل کی تشریح کی جا چکی ہے۔

جہاں ثبوت موجود نہ ہوں

جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا جا چکا ہے کہ کسی مقدمہ میں فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچنے کے لیے قاضی کے سامنے چار ذرائع ہوتے ہیں جنہیں ثبوت کہتے ہیں۔ یہ ذرائع مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ملزم یا مدعا علیہ کا اقرار (Admission or confession)

۲۔ شہادت (Evidence) جس کا ذکر آپ ان سطور میں پڑھ چکے ہیں۔

۳۔ قسم (Oath) بہت سے معاملات میں قسم کے ذریعے بھی فیصلہ ممکن ہے۔

۴۔ قرائن (Circumstances)

مقدمہ کی نوعیت کے مطابق ان چاروں میں سے کبھی ایک ثبوت ہی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے' کبھی دو کے ذریعے منصف رائے قائم کرتا ہے اور کبھی سب کو ملا جلا کر فیصلہ سناتا ہے۔ غرض کہ ان چاروں میں سے دستیاب ثبوت کے آمیزے سے قاضی کی رائے قائم ہوتی ہے جس کا انحصار مقدمہ کی نوعیت پر ہے۔

یہ چاروں ثبوت فقہ میں مرئی ہیں ان کا ادراک حواس کے ذریعے آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔ اس لیے ان کے

بارے میں کتب فقہ میں بڑے تفصیلی احکام ملتے ہیں۔ طبعی علوم میں ارتقاء و اضافے کے باوجود قرآن و سنت کے اندر رہتے ہوئے فقہ اسلامی میں ان پر نت نئی آراء کا آنا بعید از عقل نہیں۔ لیکن ان چار کے علاوہ ایک عنصر ایسا بھی ہے جس کو فقہی اعتبار سے مربوط انداز میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے' یہ عنصر قاضی کی فراست اور بصیرت ہے جو ویسے تو چاروں ثبوت کے ہوتے ہوئے بھی ہر موقع پر کام آ سکتی ہے لیکن جب یہ نہ ہوں تو فراست و بصیرت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ قاضی کی فراست و بصیرت وہاں زیادہ کام آتی ہے جہاں ثبوت بالکل موجود نہ ہو۔

عدل کے عمل میں قاضی کی فراست بہت اہم ہے۔ فراست سے مراد وہ خاص اہلیت ہے جس میں نہ تو قانون کے خشک اور خاموش الفاظ قاضی کی راہ نمائی کریں' فریقین اقرار کریں' نہ ان سے تعاون ملے' دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک حقائق کی پردہ پوشی کرے' گواہ سرے سے موجود ہی نہ ہوں یا اگر ہوں تو جھوٹ بولیں اور ایسا جھوٹ جو نہ ثابت ہو سکے اور نہ قاضی کا دل مطمئن ہو' گواہ سچ بھی بولے تو قرائن سچ کے خلاف گواہی دے رہے ہوں' امر واقعہ اور امر قانون کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں قاضی کو سخت الجھن پیش آ رہی ہو' قسم پر فیصلہ کرنا اس لیے مشکل ہو کہ واقعات قسم کے خلاف ہوں' تو پھر قاضی کی فراست کا امتحان ہوتا ہے۔ یہاں قاضی قانون کے لکھے ہوئے الفاظ سے ہٹ کر اپنی ذہانت استعمال کرتا ہے۔

تاریخ اسلام کی کتابوں میں مسلمان قاضیوں کی ذہانت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جدید دور بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلے کی صرف دو مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی کی فراست مقدمہ کا رخ متعین کرنے میں کتنا اہم عنصر ہے۔ اسی پر عدل کا انحصار ہے اس کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں بلکہ نظام سے ہے' وہ نظام جو قاضی کو ایک دائرے میں تو پوری طرح پابند کرے اور دوسرے دائرے میں آزاد چھوڑ دے کہ اس میں قاضی کو فراست کے مواقع ملتے ہیں۔

امام مسلم نے "الصحیح" میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ دو عورتیں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ کہیں جا رہی تھیں کہ بھیڑیا ایک بچے کو اٹھا کر لے گیا۔ دونوں عورتوں میں نزاع پیدا ہو گیا۔ دعویٰ یہ تھا کہ جو بچہ بھیڑیے نے اٹھایا وہ دوسری کا تھا اس کا نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر دونوں عورتیں باقی رہ جانے والے بچے کی دعوے دار تھیں۔ مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت میں جا پہنچا۔ انہوں نے واقعات سن کر بڑی عورت کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ باہر آ کر دونوں میں پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ اب دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کی عدالت میں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ "لاؤ چھری' میں کیوں نہ بچہ کاٹ کر دونوں میں آدھا آدھا تقسیم کر دوں"۔ یہ سننا تھا کہ چھوٹی عورت نے کہا "نہیں! بچہ اس دوسری کا ہے"۔ بڑی خاموش

رہی' اس سے حضرت سلیمان کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری نہ رہی کہ ماں کی مامتا سے یہ برداشت نہ ہوا کہ اس کا بچہ کاٹ کر مار ڈالا جائے۔ دوسری عورت کی خاموشی' جس کا بچہ بھیڑیا لے گیا تھا' اس بات کے غماز تھی کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ انہوں نے فوراً چھوٹی عورت کے حق میں فیصلہ دے دیا[۱۴]۔

ممکن ہے کہ اس واقعہ کو اسلامی تاریخ کا ایک حصہ سمجھ کر بطور عقیدت تو پڑھ لیا جائے اور عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق نہ سمجھا جائے۔ لیکن جدید زمانے میں بھی اس طرح کے واقعات کا ظاہر ہونا باعث تعجب نہیں۔ اب دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمایئے اور نتیجہ خود نکالئے کہ ہمارے نظام عدل میں کہاں خرابی ہے اور قاضی کے اختیارات میں کیا کمی ہے؟

جولائی ۱۹۷۷ء میں جب ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تو فوجی عدالتیں قائم ہوئیں۔ ایسی ہی ایک عدالت میں ایک شخص نے داد رسی کے لیے درخواست دی کہ اس نے بیرون ملک جانے کے لیے ایک شخص کو خطیر رقم دی۔ رقم دینے کے بعد وہ مدعاعلیہ کے گھر ملازمت بھی کرتا رہا لیکن اب وہ شخص نہ تو اسے بیرون ملک بھجوا رہا ہے نہ رقم واپس کر رہا ہے۔ درخواست دہندہ نے فوجی عدالت سے گزارش کی کہ اسے رقم واپس دلا دی جائے۔

فوجی افسر (قاضی) نے مدعاعلیہ کو عدالت میں بلایا جس نے نہ صرف رقم لینے کے الزام سے انکار کیا بلکہ اس سے بھی انکار کیا کہ مدعی اس کے گھر ملازم تھا حتی کہ کسی شناسائی سے بھی انکار کیا۔ اس مقدمہ میں کوئی گواہ تھا نہ تحریری ثبوت۔ لہٰذا رائج الوقت ملکی قانون کا تقاضا تھا کہ یہ مقدمہ خارج ہو جاتا لیکن واقعات سننے اور مدعا علیہ کو طلب کر کے بیان لینے کے بعد قاضی اس نتیجہ پر پہنچا کہ مدعی کا دعویٰ بظاہر درست ہے۔ یہاں سے قاضی کی فراست کا امتحان شروع ہوا جس کے استعمال کا اس نے حق ادا کر دیا۔ قاضی (فوجی افسر) مدعی کو ساتھ لے کر مدعا علیہ کے گھر میں ایسے وقت جا پہنچا جب اس کے گھر میں ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔ مدعا علیہ کو بلایا گیا' حسب توقع وہ گھر موجود نہ تھا لیکن دروازہ کھولنے والے بچوں نے مدعی کو پہچان لیا' اور ان کے رویے نے ثابت کر دیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازم تھا اور اس طرح فوجی افسر کو مدعی کا دعویٰ تسلیم کرنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد مل گئی اور یوں مقدمہ کا فیصلہ دعوے اور واقعہ کے مطابق ہو گیا[۱۵]۔

فراست نہ تو ایسی صفت ہے جو بزرگوں کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ گئی ہو اور نہ اسے قانون کے الفاظ میں محصور کرنا ممکن ہے۔ اس کی ابتداء قاضی کی مقصد سے لگن اور صحیح فکر سے ہوتی ہے۔ یہ ہر علاقے اور ہر زمانے کے ماحول میں رہتے ہوئے ان کے حسب حال ہوتی ہے۔ کسی ایک قاضی کی فراست کو کسی دوسرے علاقے یا زمانے میں بطور نمونہ بیان کرنا تو آسان ہے لیکن اس کی اسی طرح تقلید ممکن نہیں ہے۔ یہ ذہنی تخلیقی قوت کی ایک شکل

ہے جس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے اور جہاں شواہد نہ ہوں قاضی کی فراست سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

شہادت روزمرہ زندگی میں

یقیناً شہادت وہ اصطلاح ہے جس کا عدالتی نظام کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے شہادت اور عدالتی نظام لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ یہ بات درست ہے لیکن شہادت کا عدالتی نظام کے ساتھ ساتھ ہماری روزمرہ زندگی سے بھی بڑا گہرا تعلق ہے۔ عام زندگی میں ہمیں قدم قدم پر شہادت سے واسطہ پڑتا ہے۔ افراد کی یہی روزمرہ کی شہادتیں بعض اوقات عدالت تک بھی جا پہنچتی ہیں لیکن اگر عدالت تک نہ پہنچیں تو بھی سچی گواہی نیکی کی صورت میں انسان کے اعمال نامہ میں لکھ دی جاتی ہے۔ اس طرح جھوٹی گواہی نامہ اعمال میں سیاہی کا موجب بنتی ہے۔

کوئی طبیب جب کسی سرکاری ملازم کو یہ لکھ دیتا ہے کہ اسے ہفتہ بھر آرام کی ضرورت ہے تو یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس شخص کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ یہی شہادت استعمال کرتے ہوئے وہ ملازم دفتر سے طبی بنیاد پر چھٹی لے گا۔ کسی ٹھیکے دار کی تعمیر کی ہوئی سڑک یا عمارت کو جب انجینئر مطلوبہ معیار کے مطابق قرار دیتا ہے تو یہ بھی گواہی ہے' اسی بنیاد پر سرکاری خزانے سے ٹھیکے دار کو رقم مل جاتی ہے۔ اب وہ سڑک یا عمارت مقررہ مدت سے قبل ہی ٹوٹ پھوٹ جائے یا منہدم ہو جائے تو اس کا مطلب ہے کہ انجینئر نے جھوٹی گواہی دی تھی۔ طبیب سے کوئی شخص نسخہ لکھوا کر کیمسٹ کے پاس لے جائے اور دواؤں کی جگہ ضرورت کی دوسری چیزیں لے کر کیش میمو پر نسخے میں درج دوائیں ہی لکھوا لے تو یہ کیمسٹ کی جھوٹی گواہی ہے۔

سرکاری افسران کو اپنے ماتحت عملے کی سالانہ کارکردگی کے بارے میں رپورٹ لکھنا ہوتی ہے۔ یہ رپورٹ لکھنے کی حد تک تو عدل و انصاف سے متعلق ہے' لکھنے والا اس اعتبار سے عدل پر مامور ہے اور چاہیے کہ درست رپورٹ لکھے۔ لیکن اس کے ساتھ یہی رپورٹ ایک گواہی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر نہ صرف ملازم کو اگلے درجے میں ترقی ملتی ہے بلکہ اسی گواہی کی بنیاد پر دفاتر میں مختلف مناصب کے لیے افراد کا چناؤ بھی ہوتا ہے۔ کوئی افسر اپنے ماتحت کے بارے میں دیانت دار (Honest) کا لفظ استعمال کر دے تو ممکن ہے یہی ایک لفظ بعد میں اس کے ماتحت پر کروڑوں روپے مالیت کی سرکاری امانتوں کا بار ڈال دے۔ اب اگر اس لفظ کے غلط استعمال نے غلط فرد کو نازک کام پر مامور کر دیا اور وہ بددیانت ثابت ہوا تو رپورٹ لکھنے والا اللہ کے دربار میں جھوٹی گواہی کا ملزم گردانا جائے گا۔

ان مثالوں میں قیاس کرتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی عام زندگی میں کہیں نہ کہیں گواہی دینے کا یقیناً موقع ملتا ہے۔ چاہے اسے گواہی کا نام دیا جائے یا اس کے لیے کوئی دوسری اصطلاح وضع کی گئی ہو۔

مزید مطالعہ کے لیے

اس باب میں گواہی کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تفصیلی بیان کا یہاں موقع نہیں ہے، گواہی سے متعلق مزید موضوعات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے مندرجہ ذیل کتب مفید ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ادب القاضی، ڈاکٹر محمود احمد غازی، اسلام آباد۔

۲۔ اسلامی عدالت (اسلام کے عدالتی قوانین کا مجموعہ) مجاہد الاسلام قاسمی، لاہور۔

۳۔ اسلامی عدالت، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، لاہور۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ تمام زندگی کے تمام معاملات میں ہمیں سچ بولنے کی توفیق دے کہ یہی سچی گواہی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ الشامی، ردا لمحتار علی درالمختار، ج ۴، ص ۴۱۱

۲۔ ایضاً

۳۔ ابن نجیم، البحر الرائق شرح کنزالدقائق، ج ۷، ص ۶۰

۴۔ قاسمی، اسلامی عدالت، ص ۳۶

۵۔ ترمذی، کتاب الشہادات

۶۔ علی بن ابی بکر الھیثمی، مجمع الزوائد، ج ۴، ص ۳۰۰، بحوالہ ادب القاضی، ص ۲۰۶

۷۔ احمد بن حنبلؒ، المسند، کتاب الشہادات، ص ۴۹

۸۔ احمد بن حنبلؒ، حوالہ ایضاً

۹۔ احمد بن حنبلؒ، حوالہ ایضاً

۱۰۔ بیہقی، بحوالہ ادب القاضی، ص ۲۰۲

۱۱۔ ابو داؤد، ابواب القضاء

۱۲۔ ترمذی، ابواب الشہادات

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ مسلم، الصحیح، کتاب الاقضیہ، باب بیان اختلاف المجتہدین

۱۵۔ اشفاق احمد، جنٹل مین الحمد للہ، ص ۱۶۲ تا آخر

مصادر و مراجع

۱۔ ابن عابدین: محمد امین (۱۲۵۲ھ) "رد المحتار علی در المختار" کوئٹہ، مکتبہ ماجدیہ، ۱۳۹۹ھ

۲۔ ابو داؤد: سلیمان بن الاشعث (۲۷۵ھ) "السنن"، استنبول، دار الدعوۃ، ۱۴۰۱ھ

۳۔ احمد بن حنبل، امام (۲۴۱ھ) "المسند"، مصر، دار المعارف، ۱۳۷۰ھ

۴۔ اشفاق احمد، میجر: "جنٹل مین الحمدللہ"، لاہور، ادارہ مطبوعات سلیمانی، ۱۹۹۲ء

۵۔ ترمذی: محمد بن عیسیٰ بن سورۃ (۲۷۹ھ) "الجامع"، استنبول، دار الدعوۃ، ۱۴۰۱ھ

۶۔ قاسمی: مجاہد الاسلام، قاضی شریعت دار القضاء مرکزی امارت شریعہ بہار و اڑیسہ، "اسلامی عدالت (اسلام کے عدالتی قوانین کا مجموعہ)"، لاہور، ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۹۱ء

۷۔ غازی: محمود احمد، "ادب القاضی" اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۸۳ء

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ اول۔قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ دوم۔سنت

۳۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ سوم۔اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے مأخذ، ماخذ چہارم۔قیاس

۵۔ اجتہاد کی تعریف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری